کروّف وَف کرتا تھا — بس وُہی — میں اُسی پر عاشق ہوئی تھی —"

یہ ہم ہیں برگیتا — یہ ہم ہیں"

"کیا مطلب؟" برگیتا نے "یولیسز" کو بند کر کے اُسے حیرت سے دیکھا "کون ہیں؟"

"ہم — اور کون — یہاں ریلیجس بک سوسائٹی کے سامنے پنجاب بُک مارٹ کے آگے سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی قدیم مہک میں گم ہوتے ہوئے ابھی — سرد ہوا نرگس کے پھولوں کی پیلی مہک آ سکتی ہے... اُس وے سائڈ ہوٹل کے پچھواڑے میں آلوچے کا درخت ہے — ابھی تو دسمبر ہے، ابھی بہت دن ہیں اُس کے شگوفے کھلنے — لیکن وُہ ابھی کِھل سکتے ہیں اور اُن میں سے ایک شگوفہ یہاں تمہارے ہاتھ میں تھامے ہوئے "یولیسز" کے عین اوپر آ گرے یہ بھی ممکن ہے — وہاں جہاں جائس نے اس کا تذکرہ کیا ہے وہاں آ گرے —"

"ہوں — " برگیتا نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی شلوار کی الاسٹک ذرا ڈھیلا کیونکہ وہ اُس کی کمر میں کُھب رہی تھی" ابھی... تم وہاں ہو... اُن پُتلیوں کے پاس — لیے ایسی باتیں کرتے ہو شائد میری توجہ اس کتاب کی خریداری سے ہٹانے کے لیے میں نے تم سے چند روپوں کی گذارش کی تھی —"

"اوہ شوٗر — " مشاہد نے بے دھیانی میں اُسے بٹوہ تھما دیا۔

ریلیجس بک سوسائٹی کے فٹ پاتھ پر ایک خوانچہ فروش سنگھاڑے فروخت کر رہا تھا — اُس نے سادھوکے کے قرب و جوار میں جوہڑوں میں جہاں کنول کھلتے تھے اُن میں دُبلے پتلے مزدوروں کو لنگوٹ باندھے سردیوں کی سویروں میں اُترتے دیکھا تھا سنگھاڑے نکالنے کے لیے... انہیں پکانا اور پھر نفاست سے اُن کی سیاہ چھال ایسے کاٹنا کہ اُن کے سفید بدن کی صرف ایک جھلک نظر آوے۔ ایک فن تھا — جیسے بیسن کی پیٹھیاں والے خستہ اور کرارے بنانا بھی ایک فن ہے —

She Disliked Umbrella With Rain. He Liked Woman With Umbrella. She Disliked new Hat With Rain...

برگیتا پڑھتے پڑھتے رُک گئی — "مشاہد آر یُو شوٗر یہ ایک عظیم ناول ہے؟"

"میری رائے کی کوئی حیثیت نہیں، اسے ایک عظیم ناول قرار دیا جا چکا ہے"

ہے مکمل طور پر پڑھا ہے میں نے نہیں — آؤ آگے چلتے ہیں"
گرے ہوئے شٹرز اور بند دروازوں اور سڑک کے درمیان تک خواہش کی اور
انارکلی کی ہر شے نمائش پر تھی۔ فریم شدہ مذہبی قطعے بھی اور براز بھی... چھتریاں، جرابیں،
عورتوں کے کپڑے... سیکنڈ ہینڈ شوز اور جینز اور ملک شیک اور بہت کچھ... اور بہت کچھ...
بلبل اپنی ٹانگوں کو سائیکلوں کے گھومتے ٹائروں سے بچانا دشوار تھا اور ہر کوئی ذرا اپنے آپ
کو بچا کر چلتا تھا اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور برگیتا صرف ایک گہری ہچکی بھرتی تھی۔

"دِس از لائف —" برگیتا نے کہا۔

"یہ ہم ہیں برگیتا —" برگیتا نے کہا۔

انارکلی کے اختتام پر مسلم مسجد کا اونچا مینار لاہور کے آسمان میں اپنے آس پاس
اڑتی پتنگوں اور گڈیوں کی موجودگی میں بے آرام لگتا تھا۔

فارمن میموریل چیپل کی جرمن/ سوس/ آسٹرین طرز کی جیومیٹریکل عمارت —
اپنے اردگرد کے مشرق.... بلکہ مشرق کی بند کھڑکیوں، ٹوٹے ہوئے شیشوں والے
دروازوں۔ لکڑی کی بالکونیوں اور اُکھڑتے پلستر کے درمیان ایک بے جوڑ پیوند تھی۔

لوہاری چوک پر انارکلی کا اختتام کھیر کی ایک وسیع پرات پر ہو رہا تھا جس میں سے
دکاندار... سکوپ در سکوپ کھیر نکالتا تھا اور چینی کے پیالوں میں اُلٹ کر گاہکوں کے منتظر
ہاتھوں میں تھماتا چلا جاتا تھا۔ سنٹرل ہوٹل کی عمارت اُس پر جھکی ہوئی تھی...

"واپس چلیں؟"

"نہیں دسمبر ہے — اور چار چیزیں ہیں اور اُن میں سے ایک چیز میں تمہیں آج
دکھانا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہاری وِلیز؟"

"وہ نولٹن مارکٹ اور فٹ پاتھ کے درمیان وہاں ہے جس کونے میں لاہور میں
فحش کے اخبار پڑھنے والے فی مربع فٹ سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں.. یوں بھی وہ کسی
طور سے سٹارٹ نہیں ہو گی... کچھ جیبیں اور کچھ عورتیں بھی۔"

سیاہ آنکھوں کی اوٹ سے برگیتا نے اپنے مرد کو دیکھا اور اُس نے مسکراہٹ کو
چہرے پر آنے سے پہلے ہی سمیٹ لیا — وہ اُن عورتوں میں شامل تھی۔

عینک ساز اور پھلیرے.... لوہاری دروازہ۔

مسلم مسجد کے نیچے بھٹیروں کی دوکانوں کے پہلو میں سے ایک تنگ راستہ فصیل... یا جو کچھ ملبے اور بھربھری سرخ اینٹوں کی صورت میں یہاں... کہیں وہاں کہیں تھا اُس کے گرد جو سبزے اور پانی تھے اُن کی طرف نکلتا تھا — ایک زمانے میں وہاں اور پانی تھے اور اَب وہاں کچھ بھی نہ تھا.... اُس زمانے میں مشاہد موچی دروازے کی سے اُترتے گوالمنڈی چوک سے ذرا اِدھر ایک مکان میں رہتا تھا.. وہ کیا اُس کے والدین بہن بھائی رہتے تھے... جس کی بلند چھت پر شہر بھر کی پتنگیں اور گڈے گرتے تھے اور عالمی کی آگ سے جنم لینے والے راکھ پرندے گرتے تھے... چودھری اللہ داد کو گرم دوپہروں میں خس کی ٹٹیوں کی مہک اور نمی میں منہ کھولے خراٹے لیتے ہوئے وہ چپکے چھوڑتا اور لوہاری اور موچی دروازے کے درمیان میں فصیل کے ساتھ ساتھ جو سائے والے گھنے درخت تھے اُن میں آجاتا اور وہاں ایک دنیا آباد ہوتی — پہلوان اور کے پٹھے ... کہ وہاں مختلف اکھاڑے بھی تھے۔ اندرون شہر کے شوقین اپنے بٹیروں پنجروں کے ساتھ ... کہ وہ اپنے پرندوں کو شہر کے تنگ حبس سے نکال کر کھلی فضا میں سائے میں، اس سائے میں بہتی چھوٹی سی نہر کے کنارے سانس لینے کے لئے لے آتے ہر عمر کی خواتین کپڑے دھو رہی ہوتیں اور محلے میں ظہور پذیر ہونے والے سکینڈلز بارے میں ایسی اشاریاتی زبان میں تبادلہ خیال کر رہی ہوتیں جو ابھی مشاہد کی سمجھ سے باہر تھی۔ اُن کے بچے نہر میں بے دریغ چھلانگیں لگا رہے ہوتے اور مشاہد بھی اُن میں شامل کر ایک آزاد اور بے دھڑک بچہ بن جاتا... دو چار چھلانگوں اور ڈبکیوں کے بعد اُس جسے کے لُوں بہت سرد پانی سے کھڑے ہو جاتے اور وہ اپنی نیکر دوبارہ پہن کر اطمینان سے گھر واپس پہنچ جاتا اور وہاں ابھی تک — ہنوز — چودھری اللہ داد خس کی ٹٹیوں کی مہک اور نمی میں منہ کھولے خراٹے لے رہے ہوتے...

لوہاری دروازے کی محراب کے نیچے ایک چھوٹے سے حجرے میں سے ایک ملنگ گدڑیوں کے ڈھیر میں سمٹا بیٹھا تھا کیونکہ تمامتر ملنگی کے باوجود یہ دسمبر تھا اور وہ ایک عام انسان تھا اور اُس حجرے میں دھوپ کا گذر کبھی نہ ہوتا تھا — تالوں کی دوکان۔ شفاخانہ جراحی۔ کریانہ سٹور۔ بان کی رسیوں کی دوکان۔ تمباکو فروش۔ ٹوپیاں بنانے والا ایک ادھیڑ عمر کاریگر... پھل فروٹ۔ اور کسی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر مولوی صاحب گرجتے ہوئے... نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں... غیظ و غضب کے عالم میں پڑھتے ہوئے..

یہاں برگیتا کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ کی۔
ناتواں کی پسلیوں کی طرح الگ الگ چھوٹی خستہ حال اینٹیں اور اُن کی درزوں میں پرانے چونے کا سفوف جھڑتا ہوا — ایک جھروکہ.. کہیں چونے کا لیپ ابھی باقی کہیں غور کی شکل نمایاں ہوتی۔ برسوں کی بارشوں اور موسموں کی سختی جھیلنے کے بعد اب بھی تاحدِ تنگ بازار کے اُوپر معلق اور اُس پر "بیٹھک کاتباں" کا بورڈ آویزاں اور اِس کے برابر میں ایک اور خوشنما مگر مسمار ہوتا ہوا چھوٹا سا جھروکہ جس کے نیچے سے گزرنے والوں کو ہمہ وقت خدشہ کہ یہ ابھی ریزہ ریزہ ہو گا اور اس پر اُبھرے گل بوٹے اُن کے دامنوں میں آگریں گے — چند تنگ سیڑھیاں اُوپر جاتی دکھائی دیتیں تھیں۔

مشاہد رک گیا۔

"ہاں" برگیتا نے ہچکی بھرتے ہوئے پوچھا۔

وہ سیڑھیوں کے اندر چلا گیا — "آ جاؤ"

چھوٹی اینٹ اور چونا اور بہت مخدوش اور گرنے والی تعمیر.. اتنی تنگ کہ ایک شخص بھی کندھے بچا کر اگلی سیڑھی پر قدم رکھتا تھا۔ برگیتا سانس روکے اُوپر چڑھتی رہی.... اور ایک دھواں زدہ چھوٹا سا کمرہ.... درجن بھر کاریگر جوتے اور سینڈلیں بنانے میں محو اور ایک سیاہ رنگ کی بے دھڑک سی عورت اور ایک مرد کو یکدم اپنے اُوپر کھڑے دیکھ کر اور بھی متجسس بھی — کمرہ اتنا مختصر تھا کہ وہ مشاہد اور برگیتا کے داخل ہونے سے تقریباً پُر ہو گیا تھا...

جھروکہ اسی کمرے میں سے کھلتا تھا... کواڑ میں ابھی ایک پرانا اور گدلا شیشہ باقی تھا.. نیلے رنگ کا۔

"میں — ذرا اِس میں سے جھانکنا چاہتا ہوں.. اگر آپ اجازت دیں تو..."

کاریگر جوتوں کے تلووں پر سریش لگا کر اُنہیں جوڑتے رہے اور اُنہوں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا.. مشاہد جھکا ہوا جھروکے تک گیا اور زور لگا کر وہ کواڑ کھولا جس میں نیلے رنگ کا ایک شیشہ باقی تھا... کچھ گرا یا ٹوٹا.... نیچے لوہاری بازار تھا.. شفاخانہ جراحی.. حلوا کی دو دکانیں... تمباکو فروش ...

کون تھا جو اِس جھروکے میں بیٹھتا تھا...

کون تھا —

اِس شُو فیکٹری کے پہلو میں ایک پرانی دیوار اور کچھ کھنڈر تھے اور اُن پر سینکڑوں کی تعداد میں قطار اندر قطار اپنی سریش کے سوکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ حویلی تھی جناب عالی — ہم تو کاریگر لوگ ہیں دہاڑی دار لیکن اِدھر رہنے بوڑھے کہتے ہیں کہ مہندی صاحب کی ماں یہاں پر مجرا کرتی تھی اور یہ حویلی اُسی کی تھی۔

ہاں جی بالکل ... کوئی ساٹھ سال پہلے ناچ گانا اِس علاقے میں ہی ہوتا تھا اور یہاں سب گانے والیاں رہتی تھیں اور بڑی بڑی نامی گرامی ... توبہ توبہ نام بھی اِس کا چوک چکلہ تھا...

پرانے مکینوں کے لئے اب بھی — اِن دنوں بھی- یہ چوک چکلہ ہے۔

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں — شکار — وادیٔ سوات — کامران کی بارہ دری اور — چوک چکلہ۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے — اور دھواں اُس سریش سے اُٹھ رہا تھا جسے بجلی کے ہیٹروں پر گرم کیا جا رہا تھا — سریش جتنی گرم ہو گی اتنی ہی جوتی پائیدار ہو گی۔ پتھر جوڑنا نال سریش کہیا —

کاریگروں کے ہاتھ نہایت مشاقی سے گرگابیوں کی ایڑھیوں پر سریش لگا رہے تھے۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے.... حویلی کے کھنڈر میں چند مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی سُریلی ہو رہی تھیں۔

اُس زمانے میں وڈیو کیمرے ہوتے تو آج ہم اپنی ٹیلی ویژن سکرین پر اِس حویلی اور اِس کے جھروکے کے سائے میں کسی مغل منی ایچر میں سے نکلتی ہوئی رقاصہ کی تصویریں حرکت میں دیکھتے ... اور آج کیا دیکھتے ہیں — سریش- گرگابیاں اور شک کرتے کاریگر۔

وہ نیچے آ گئے۔

نیچے ہر سُو خوار کیں تھیں۔ اگر پیرس کے میکسیم میں دنیا کی بہترین خوراک میسر ہے تو لاہور کے لوہاری میں دنیا کا بہترین ناشتہ ملتا ہے کیونکہ اکثر لاہوری کھانے کے لئے زندہ رہتے ہیں کہ زندہ رہنے کے لئے کھانا تو مجبوری ہے جب کہ کھانے کے لئے زندہ رہنا ایک فن اور بلند آئیڈیل — پُوری حلوہ... کچوریاں... چنے... دہی کلچے- لسّی... سری پائے... کھد اور زبان اور حاجی کی نہاری اور ہر وہ شے جو آپ کا کولسٹرول ہائی کر کے آپ

جلد از جلد مالکِ حقیقی سے ملا دے...
حویلی خراسیاں.... نہ جی نہ... ایک خشمگیں دوکاندار اُن کا راستہ روک لیتا ہے — آپ اندر نہیں جا سکتے.. اندر تو کُتا کھُلا ہوا ہے — اور کُتا صرف اِس لئے کھُلا ہوا ہے کہ اندر ایک پرانا مندر ہے، کہتے ہیں چند دیدہ زیب مجسمے بھی ہیں اور اِس متروکہ جائداد پر قبضہ کرنا ہے اور اگر محکمہ اوقاف کو خبر ہو گئی کے اندر مندر ہے تو مشکل درپیش ہو گی اِس لئے — اندر تو کُتا کھُلا ہوا ہے۔

اُدھر چوک جھنڈا کی چاول منڈی سے چڑیوں کا بے پناہ شور یہاں تک آ رہا تھا... جہاں ہر جانب چاول بکھرے ہوں گے وہاں چڑیاں تو ہوں گی اور شور تو مچائیں گی۔

برگیتا نے ایک گلی میں جھانکا "یہ بورڈ پر کیا لکھا ہے؟"

گلی مونج کُٹاں... یہاں جیلوں میں سے قیدیوں کو لا کر اُن سے مونج کُٹوائی جاتی تھی... اب پورا ملک مُونج کُوٹتا ہے — تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے —

ٹین کے بوسیدہ چھجے پر جھولتا "شاہد پٹیالہ بینڈ" کا بورڈ اور اِس مختصر نیم سیاہ بیٹھک تک جاتی ایک تاریک سیڑھی جس پر قدم رکھتے ہوئے برگیتا گھبراتی تھی "کیا یہ لوگ مائنڈ نہیں کریں گے؟"

"نہیں" مشاہد اُس کے آگے آگے اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا "یہ اور طرح کے لوگ ہیں —" .

"اوئے بسم اللہ ..." بیٹھک میں داخل ہوتے ہی ایک آواز آئی اور اُس آواز کے ساتھ ہی موسیقار آقا نواز کا سراپا آیا اور یہ سراپا جو بنا تھا تو ایک پرانے کوٹ اور ایک بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی سے بنا تھا اور یہ ترکی ٹوپی یہ فیض — اَب سرخ نہیں کالک اور میل سے نیم سیاہ ہو چکی تھی اور بسم اللہ.... کون آیا ہے — بسم اللہ.... سوائے چرس کے طویل کشوں کے لہجے میں اتنی مہمان نوازی اور دوستی ممکن نہیں —

بیٹھک میں موسیقی کی غربت تھی۔

مختلف باراتوں کے ساتھ بینڈ کی تصویریں — گال پھلائے کلیرنٹ پھونکتا کوئی مونچھوں والا اُستاد اور یہ تصویر اتنی پرانی تھی کہ اُستاد کی سفید مونچھیں بھوری ہو کر سیاہ ہونے کو تھیں.. چند اخباری تراشے... امانت علی خان۔ مہندی حسن۔ اُستاد شریف خان پونچھ والے.. بڑے غلام علی خان.. اُستاد برکت علی خان کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ

تھی... غلیظ دری پر جس میں بہت بُو تھی وہ دونوں بیٹھ گئے... موسیقار آقانواز لہرا کر
کے سامنے براجمان ہو گیا — "ہم جناب عالی باؤ بینڈ سے زیادہ سُر میں ہیں..... اس کا
ڈولی کے پیسے الگ ہوں گے — سرکار میری آرٹسٹ کو سُر میں تو ہونا چاہئے.. باؤ بینڈ
سُر میں نہیں ہیں.."

"کونسے باؤ بینڈ والے؟"

"یہ —" موسیقار آقانواز اُسی طرح اپنے اوورکوٹ اور تُرکی ٹوپی میں لہرا
اٹھا — کاش کہ ٹوپی کے ساتھ پُھندنا بھی موجود ہوتا تو صورت حال زیادہ لہراتی.. "
ہمارے سامنے بورڈ لگا کر اپنے آپ کو موسیقار کہتے ہیں —" وہ بالکونی پر ذرا جھول کر
گلی کے پار مشاہد نے وہ بورڈ نہیں دیکھا تھا جو موسیقار آقانواز کے دل میں
کی طرح چُبھتا تھا اور جس پر "باؤ بینڈ لدھیانے والے" اب مشکل سے پڑھا جاتا تھا۔

"میں نے — میں نے" موسیقار آقانواز نے اپنے کوٹ کی چھاتی پر ہتھیلی
کہا "ایک ہزار سے زیادہ گانے کمپوز کئے ہیں — اور جناب عالی صدقے پنج تن پاک
خواجہ صاحب — اپنے خواجہ صاحب خورشید انور سن لیتے تو کہتے موسیقار آقانواز
بس تم ہو — ہم کیا ہیں.. یہ کہتے خواجہ صاحب... پر وہ تو فوت ہو گئے ہیں اب کیا کریں

"ایک ہزار گانے؟"

"ہاں جی — پر ہم نے اُن کو ریکارڈ نہیں کرایا —"

"کیوں؟"

"اپنے فن کو بیچ دیتے — اپنی کمپوزیشن بیچ دیتے..." اُس نے پھر ہتھیلی اوور
کی چھاتی پر رکھ کر اعلان کیا "یہاں دفن ہیں میرے بچے — سرکار میری کمپوزیشن مو
کا بچہ ہوتی ہے — یہاں دفن ہیں — اور جب میں مروں گا اللہ بخشے تو اِدھر ہی
ہوں گا اور میرے ساتھ یہ دفن ہو جائیں گے — فن کو بیچیں گے نہیں — خ
صاحب بیچتے تھے"

برگیتا مسکراتی رہی۔ وہ بہت زیادہ سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اِس شخص
انفرادیت اور طرز زندگی سے متاثر ہو رہی تھی — ایک چھوٹی سی بیٹھک، بازار میں
سالِ خوردہ بالکونی، جہاں شام ڈھلے چند موسیقار آتے تھے اور اپنے ساز ساتھ لے آ
تھے.. اور اپنے اپنے سیکسافون۔ کلارنٹ یا ٹرمپٹ پر شادی بیاہ کے موقعوں پر پسند کی جا

دھنوں کی پریکٹس کر کے چلے جاتے تھے... اگر کوئی بکنگ آ گئی تو اپنی اپنی وردی اور
جو دیلیں نچھاور کرتے تھے وہ نصیب اپنا اپنا — دن کے وقت وہ کہیں خوانچہ لگاتے
کہیں کلرکی کرتے تھے یا بیکار پھرتے تھے۔
شاہد نے اُٹھتے ہوئے پچاس روپے کا ایک نوٹ موسیقار آقا نواز کی گود میں رکھ

"بسم اللہ — " موسیقار آقا نواز اُٹھا اور ذرا لہرایا۔ " پر جنج ڈولی کے پیسے الگ ہوں
اور راجہ کی آئے گی بارات، کے الگ ہوں گے..."
گلی کوچے... کوچے گلیاں..
بدن میں سفر کی تھکان تھی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی لیکن اس کے باوجود برگیتا
پر آئی ہوئی تھی اور شوقن میلے دی — اور میلے کے شوقین تھکتے نہیں.. چلتے جاتے

چار چیزیں ہیں —
اور کیا خوشی کا چار مرغابیوں سے واقعی کوئی تعلق نہیں —
اور اگر یہ ہم ہیں تو شگوفے کہاں ہیں — وَف.. وَف.
کوچے گلیاں۔ گلی کوچے۔
کوچہ داروغہ نزول۔ کوچہ خیمہ دوزاں۔ کوچہ دھوبیاں... ماتکیاں... سیٹھیاں..
ہاں۔ سید مٹھا بازار کے کوچے..

مینوں دس خاں شہر لاہور اندر
کنّے بوہے تے کنیاں باریاں نیں،
تینوں دساں میں شہر لاہور اندر
لکھاں بوہے تے لکھاں باریاں نیں....
اِک کھولاں۔ اک کجّاں۔

قرۃ العین حیدر اپنے رکھ رکھاؤ میں بہت محو اور بہت بظاہر بے پرواہ ایک گلی میں
گئی ہیں "ارے — یہ تو بالکل لکھنؤ کی طرح ہے —"
"صرف ایک فرق کے ساتھ عینی آپا —"
"وہ کیا؟" عینی آپا کی تیوڑھی چڑھ جاتی ہے۔

"لکھنؤ۔ کب کا اجڑ چکا۔ لاہور آباد ہے —"

عینی آپا شائد ری ایکٹ کرنا چاہتی ہیں پھر اُوپر تنگ بازار کے اُوپر آسمان کے اِ
مختصر ٹکڑے کو دیکھتی ہیں "مے بی یو آر رائٹ —"

تینوں دساں میں شہر لاہور اندر —

اور چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں...

شاہ حسین باغبان پورہ سے عصر کے وقت چلتے تھے — دلّی دروازہ۔ سنہری م
مسجد وزیر خان تنگ بازار اور پھر ورق والا بازار جہاں چاندی کے ورق کوٹے جاتے تھے
ایک ردھم ایسی جسے ورق کوب ہی پہچانتے ہیں — گہری دھمک اور دل پر ضرب لگ
والی ردھم جس کے آگے صرف بے بسی اور بے اختیاری ہے — جب شاہ یہاں
صادق ورق کوب کی دوکان کے آگے تو فریدالدین عطار سے بندھ جاتے اور ورق کو
ضربوں پر دھمال ڈالتے — اور پھر مغرب راوی کے کنارے پر پہنچ کر ادا کرتے —

اَساں اندر باہر لال ہے — اَساں مرشد نال پیار ہے۔

مشاہد بھی اِس ردھم سے آشنا تھا۔ رنگ محل مشن ہائی سکول سے واپسی پر م
دروازے کی جانب چلتے ہوئے — دھم دھم... کبھی مدھم کبھی بلند اور دھم دھما
ورق۔ ورق۔ ورق....

ایک ڈھکے ہوئے بازار میں ایک باریش شخص کی دُوکان پر سب سے زیادہ آنکھ
والیاں اور سیاہ برقعوں والیاں پھوٹتی ہوئی کونپلیں تھیں اور وہ صرف سُرمہ بیچتا تھا —
نور والا ہے اور سَک بھی بیچتا تھا جو — کشمیر والا ہے — اور یہ سیاہ ریش دوکان کا
سُرمہ اپنی آنکھوں میں ڈالے کئی نسلوں سے صرف سُرمہ بیچتا تھا اور سَک بیچتا تھا —
سیاہ اور پوشیدہ آنکھوں والیاں ہنستی تھیں اپنے برقعوں کی اوٹ میں جن کے چہرے
بدن ابھی پھوٹ رہے تھے تو یہ نیم خواندہ اندرونِ شہر کی لہورنیں تھیں اور اُن کے
کے اندر ہی عشق شاہ حسین والی دھمال ڈالتا تھا اور یہ وہی کھوئیاں تھیں جہاں سے
پانی بھرتے تھے۔

جنہاں کھُوئیاں تے بھرن معشوق پانی —

لال حویلی کے بارے میں سرکاری کاغذات پر مرقوم ہے —

پراپرٹی نمبرD/ 749
لال حویلی کی چار منزلہ عمارت لوہاری منڈی بازار جو کہ پیر بھولا سٹریٹ کے شمال
واقع ہے۔ 1940ء میں عنائت علی ولد میراں بخش اِس کا مالک تھا۔ 1980ء
سہیل اکرم، ممتاز بیگم، ایم سعید اور ایم صدیق کی جائداد بن گئی — مقامی روائت
کہ یہ حویلی مہاراجہ کشمیر نے اپنی ایک رقاصہ دارو کے لئے تعمیر کی تھی۔ تاریخ تعمیر
بیسویں صدی کے آخر میں بتائی جاتی ہے —
حوالہ پراپرٹی نمبرD/ 749 کا اختتام ہوتا ہے۔

لوہاری منڈی بازار ڈھکا ہوا تھا... جیسے پاکستان بننے سے پیشتر شاہ عالمی کا سارا بازار سرے سے دوسرے سرے تک ڈھکا ہوا ہوتا تھا اور اُس میں چلنے والیاں فربہ متمول بنیاں جب نظر اُٹھا کر اُوپر دیکھتی تھی تو آگ برساتا آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ کپڑے ترپال کے سائبان تنے نظر آتے تھے۔ پر یہ تو سرما کے دن تھے اور چھاؤں نہیں دھوپ کی ضرورت تھی اور پھر بھی لوہاری منڈی بازار ڈھکا ہوا تھا... کہیں سے آسمان کا ایک حصہ دکھائی دے جاتا تھا تو وہیں سے اِس بازار کے سائبانوں پر جھُگی جھلک دکھتی تھی.. لال حویلی کی سرخ عمارت کے جھروکے اور کھڑکیاں حیرت کی ہیبت میں اتنے گم کہ اُن کی اِینٹیں لرزتی تھیں اور پلستر لرزتا تھا اور وہ حیرت کی ہیبت میں گم — لاعلم کہ اِینٹیں اکھڑ رہی ہیں پلستر لرزتا ہے —

راستہ ایک تنگ اور گندی نالیوں والی گلی کے اندر تھا اور دروازہ کھُلا تھا اور اِس دروازے میں سے بھی سریش اور چمڑے کی مخصوص بُو نیچے اُتر رہی تھی۔ سیڑھیاں جو اوپر جاتی تھیں دماغ کو گھماتی تھیں۔ اتنی تنگ اور عمودی کہ صرف دیکھنے سے یقین نہیں آتا تھا کہ اُن پر پاؤں رکھ کر اُوپر تک جانا ممکن ہے۔

دروازے سے متصل ایک مخصوص لاہوری وضع کے مکان کی تاریکی میں سے جھانکتا ہوا ایک نوجوان اِنہیں دیکھ کر مسکرایا بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ برگیتا کو دیکھ کر مسکرایا اور کھڑکی سے کود کر اُن کے پاس آگیا۔

"آر یو ٹورسٹ؟"

"نہیں —" برگیتا نے کہا" پاکستانی —"

نوجوان نے کچھ دیر اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچا جس میں

مایوسی سے سرہلاتے ہوئے اپنے مکان میں واپس لوٹ جانا سرِ فہرست تھا... دوسرے نمبر
صرف شغل میلے کے لئے اُن کے ساتھ گپ لگانا تھا ٹائم پاس کرنے کے لئے
اُس نے سر کھجایا اور کہنے لگا... "میرا خیال ہے کہ آپ تو اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں؟
اُس نے مشاہد کو غور سے دیکھا..

مشاہد خاموش کھڑا رہا —

"جنابِ عالی یہ کنجری کی حویلی ہے — " اُس نے لفظ "کنجری" کا ردعمل اُن کے
چہروں پر نہ پا کر پھر سر کھجایا اور ٹائم پاس کرنے کے لئے باتیں کرنے لگا" ہاں جی، کنجری کی
حویلی ہے۔ بہت لوگ دیکھنے آتے ہیں... بے غیرتی بہت ہو گئی ہے پاکستان میں۔ ہمارے
مولوی صاحب نے پچھلے جمعے کہا تھا کہ اِس پر بُرجیاں بنا کر میت بنالیں تو پاک ہو جائے
پر جی کون مانتا ہے — "

مشاہد نے نوجوان کے کندھے پر ایک دوستانہ تھپکی دی۔ "کیا نام ہے تمہارا۔"
"گفور — یہ لوگ کسی کو اندر نہیں آنے دیتے، کہتے ہیں ہمارے کام کا حرج
ہوتا ہے۔ ایک بندہ بھی چکر لگا جائے تو کاریگر اُسے دیکھتے ہیں؟ اور کم سے کم تیس گرگابیاں
کم بنتی ہیں"

"یہاں بھی گرگابیاں بنتی ہیں...؟" برگیتا نے پوچھا۔

"ہاں جی — وہ برگیتا کے التفات سے خوش ہوا" لیڈی شوز کی ایڑھیاں، گرگابیاں
تھوک کے حساب سے بنتی ہیں درجنوں کاریگر لگے ہوئے ہیں۔ کارخانہ ہے موچیوں کا
اِدھر شہر کے اندر جتنی بھی پرانی حویلیاں ہیں اُن میں سے اکثر میں یہی کام ہوتا ہے... کرا
بہت دیتے ہیں گرگابیاں بنانے والے... یہ ہر کسی کو اندر نہیں آنے دیتے پر میرے واقف
ہیں آؤ — آجاؤ بہن جی — " اُس کی شُہدی نظر برگیتا کے واضح بدنی زاویوں سے اٹی
تھی اور اپنی جنسی خواہش کو بہن جی میں لپیٹ دینا کتنا آسان اور محفوظ ہے۔

سیڑھیوں کی تعمیر جان بوجھ کر اِس انداز میں ترچھی کی گئی تھی کہ ہر قدم کے بعد
اگلا شخص اوجھل ہو جاتا تھا — صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک شخص اُوپر جا سکے... یا نیچے
سکے... سیڑھیوں میں کہیں کہیں چوکور روشندان تھے جن سے شہر کا شور اندر آتا تھا...
اندر، گراؤنڈ فلور پر ایک فوارّے کے خشک باقیات تھے جس کے گرد ایک ہشت
پہلو تالاب میں جہاں پانی ہوتا تھا وہاں سریش کے ڈبّے اور چمڑے کی کترنیں تہہ در تہہ

اوپر چوتھی منزل تک تمام کھڑکیاں... درجنوں رنگ دار شیشوں والی — بیل
گلرنگ بیل بوٹوں والی کھڑکیوں کے پٹ پہلی سے چوتھی منزل تک سارے کے
اسی مرکزی ہال میں خشک پڑے فوارے پر کھلتے تھے جس میں سریش کے ڈبے اور
کی کترنیں پڑی تھیں۔

منزل پر پہنچ کر کھڑکی سے نیچے جھانکتے اور نیچے موچی جوتے بناتے ہوئے اور
کے تالاب میں سریش کے ڈبے اور چمڑا —

چوتھی منزل پر ایک مستطیل کمرہ تھا جس کا بڑا جھروکہ بازار پر کھلتا تھا اور جھروکے
کسی باکمال کاریگر کے ہاتھوں کی صناعی گل بوٹوں اور پچی کاری کے کام میں اب
دکھائی تھی.. رنگین شیشوں کے موزیک میں ایک کائناتی توازن تھا۔ اور ایسے اور
جن کے سنگِ مرمر اور سنگِ سرخ کے فرش ایسے تھے کہ نظر اُن پر پڑتی تو
رہ جاتی اور ان میں بھی کھڑکیاں اور جھروکے ایسے تھے کہ تصویریں تھیں۔

درجنوں کمروں میں — جھروکوں کی چھتوں پر جو شیش محل تھے تو اُن میں کسی
رقص کے انداز عکس نہیں ہوتے تھے بلکہ گرگابیاں بناتے ہوئے کاریگر، کے تو
تیز سگرٹ جلتے ہوئے، سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کے ڈائیلاگ دوہراتے ہوئے
خیبے کھجاتے ہوئے کہ اُن کے سامنے ریما اور مدیحہ شاہ کے ہیجان خیز پوسٹر اُنہیں
رکھتے تھے اور ایک بُو چمڑے، سریش اور کاریگروں کے غلیظ بدنوں کی ملی جلی —
عکس ہوتا تھا اُن شیش محلوں میں۔

سلجوق دی آرکیٹیکٹ کا کہنا ہے کہ اس حویلی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا
ہونا ہے.... فنِ تعمیر میں اہم ترین ضرورت کسی بھی عمارت کا اس کے مکین کی
زندگی اور اُس کے پیشے کے مطابق فنکشنل ہونا ہے — اگر اس میں ایک کاروباری
قیام کرنا ہے تو — اگر ادیب یا شاعر کو وہاں رہنا ہے تو — ایک سیاست دان کی
بھی مختلف نوعیت کی ہوں گی — لیکن ایک طوائف کے بھی تو فنکشنل مسائل
پرائیویسی — نیم تاریکی، فوارے کے پانیوں کی ٹپ ٹپ کا رومانس، خواب گاہیں
رسائی آسان نہ ہو — اور یہ سب فنکشن لال حویلی میں موجود تھے..

مرکزی جھروکے میں سے برگیتا نے نیچے بازار میں جھانکا... سائبانوں کا ایک غیر
سلسلہ جس کے نیچے جو زندگی رواں تھی اُس کی یہاں سے خبر تک نہیں ہوتی —

اس شیشہ گری کے ہال میں سے جہاں ہر شیشہ یہ کہتا ہے کہ اور کون ہے آئینوں میں ...
ہی تو ہے — شیشے کے جتنے زیادہ ٹکڑے ہوں گے اُن میں اتنے ہی عکس ہوں گے ...
کے... جو اپنے آپ کو حالتوں میں دیکھنا پسند کرتا ہے... شاہ جہاں نے ممتاز کی محبت کے
باوجود ایک ایسا محل تعمیر کروایا تھا جس کی چھت ایک عکس در عکس شیشوں کی دنیا تھی کہ
وہ اپنے سراپے کو دیکھ سکے اور کنیز کو صرف اپنا پسینہ آلود چہرہ نظر آوے...

مستطیل کمرے کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ایک تختہ نصب تھا اور ...
صرف تختہ نہیں ایک مخفی دروازہ تھا جو اپنی موجودگی سے حیران کرتا تھا۔ یہاں سے ...
تنگ سیڑھیوں کا ایک تاریک گھیرا اُوپر کو اُٹھتا تھا...

"اوپر کیا ہے گفور..." برگیتا نے پوچھا....

"گفور نہیں — غفور —" مشاہد نے کہا۔

"ہاں جی گفور ہی میرا نام ہے — اوپر بہن جی کچھ بھی نہیں... آپ ادھر ...
ذرا کھڑکی سے نظارہ کریں — نیچے فوارہ چلتا تھا اور کہتے ہیں کہ فوارے کے ...
مہاراجے کے ملازم اُس وقت ڈیوٹی پر ہوتے تھے اور آتش بازی چھوڑتے تھے — ...
کھڑکیاں... چوتھی منزل کی... کھلی رہتی تھیں اور اس شیش کمرے میں جو کوئی بھی ہوتا ...
اُسے کھڑکی سے باہر انار چھوٹتے دکھائی دیتے تھے۔ بس جی عذابِ الٰہی تھا۔ عیاشی کی ...
حد ہوتی ہے اسی لیے اب یہاں جُوتے بنتے ہیں —"

بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن ایک تاثر جُوں کا تُوں تھا۔ حویلی کے کھڑکیوں، روشن
دانوں اور دروازوں میں سے اندر آنے والی روشنی کے آہستہ آہستہ تاریک ہونے
زاویے وہی تھے... عمارت کی گہری سرخی میں ایک نیم سیاہ کیفیت تھی — باہر دوپہر کی ...
تھی لیکن اندر شام ہو رہی تھی۔ خواہشوں کا ایک اندھیرا ہمہ وقت اُتر رہا تھا — ...
دنوں جب حقیقت میں شام اُترتی تھی تو شائد ادھر چوکھٹوں پر اور جھروکوں میں اور ...
شیشوں کے عقب میں دیئے جلتے تھے — اینٹ اور گارے میں کاماسُترا کی تفسیر...

برگیتا نے ایک ہچکی بھری کہ اُس پر یہ حویلی جنس اور خواہش کے انکشاف کے طور
پر ظاہر ہو رہی تھی "کیا ہم اوپر جا سکتے ہیں؟"

"اوپر کچھ بھی نہیں ہے —" مشاہد نے پلٹ کر کہا۔

ایک کاریگر جو بہت دیر سے برگیتا کی پُشت پر سریشی نظریں جمائے اُنہیں دیکھ رہا تھا

نزلنا "اوپر مائی نُوراں ہے جی —"

مشاہد بھی مسکرایا اور دیوار میں نصب تختے کو ایک کونے سے پکڑ کر اپنی جانب کھلا — جیسے وہ جانتا تھا کہ کس زاویے سے وہ کھلے گا۔ وہاں بھی سیڑھیاں تھیں۔

اور تنگ سیڑھیوں کے گھیرے میں دم گھٹتا تھا۔

ورٹیگو کی کیفیت ذہن پر سوار ہوتی تھی۔

سیڑھیوں کے گھیرے کا جہاں اختتام ہوتا تھا وہاں بھی ایک تختہ تھا لیکن وا تھا۔ وہ رکا تو برگیتا کا ماتھا اُس کی کمر سے آ لگا...

وہ کھانسا اور آگے ہوا۔ آگے ایک مختصر سا نیچی چھت کا کمرہ تھا... اور چھت پر بھی شیشے کا نازک کام جیسے ٹوٹنے کو ہو۔ کمرے کی وسعت جتنا ہی ایک جھروکہ جس کے جھکاؤ پر نیلے اور زرد رنگوں میں باریک بیل بوٹے اور دربار کے منظر تھے... جہاں جہاں سے یہ آرائش اکھڑ چکی تھی وہاں کہیں صرف لباس تھے اور سَر نہ تھے اور کہیں درباریوں کے درمیان میں سے اینٹیں ظاہر ہو رہی تھیں — یہ نیم تاریکی میں کم دکھائی دے رہے تھے لیکن دربار کا جلال اور شاہی لباس ابھی تک بُرش جس نے انہیں بنایا تھا اُس کے رنگوں میں گیلے اور تازہ لگتے تھے۔ فرش سیاہ پتھر کی سلیں تھا جس پر چند اَن دُھلے برتن، ایک سلور کی دیگچی اور چینی کی کچھ پیالیاں جن کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے اور اُن کے درمیان میں بیٹھی ہوئی خاتون کی جھکی ہوئی پشت اُن کے قدموں کی چاپ سے سیدھی ہوئی اور اُس نے مڑ کر دیکھا — "مشاہد جی — بسم اللہ" وہ راکھ بھرے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر بمشکل اُٹھی کہ گھٹنوں کے درد کی ٹیس اُس کی زبان تک جاتی تھی — لنگھ آؤ —"۔

سیاہ آنکھیں جن میں مشاہد کے لیے شک کے جھروکے تھے اس کی جانب وا ہوئے کہ تم اسے جانتے ہو اور مجھے بے خبر رکھا۔

"یہ میری بیوی ہے —" مشاہد نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"لگتی تو دیسی ہو پر بڑا مشکل اور انگریزی نام ہے تمہارا —" وہ ابھی تک جوڑوں کے درد میں سے اُٹھ رہی تھی "مشاہد جی تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں — آ جاؤ۔"

اُس نے مشاہد نے، برگیتا کو دیکھا کہ اِسے دیکھ لو — اس کی شکل دیکھ لو۔ اِسے تم رکھنے کا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا — تم جوانی کے تناسب میں ہو اور یہ ایک بڑھیا ہے

— ستر سے اوپر — تمہیں اس سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود
نے یہاں حسد کی وہی سُول اپنے سینے میں کُھبتی محسوس کی جو وہ مشاہد اور مرواں
الفت بھری ہنسی سے — سات کمروں والی کوٹھی کے مستطیل کمرے میں آتی ہنسی
محسوس کرتی تھی۔

"بیٹھو — پر ادھر کوئی تمہارے لائق تو جگہ نہیں ہے —" اس نے ایک دیو
کے ساتھ لگی ایک پیڑھی فرش پر سیدھی کر دی۔

وہ جب کھڑی ہوئی تو اُس کی ایستادگی میں ایک عجیب شاہانہ پن تھا۔ ایک حُسن
گُم گشتہ غرور تھا... پر حُسن اَن جھرّیوں میں اور دھنسی ہوئی آنکھوں اور اُن کے گرد کو
کے پاؤں ایسے حلقوں میں تو نہیں تھا — "چائے پیو گے؟" اُس کا سراپا آئینوں میں چ
تھا... اور کون ہے آئینوں میں... بس تو ہی تو ہے — جب آئینے تھے تو حُسن نہیں تھا او
اب آئینے ہیں پر حُسن کہاں —

وہ راکھ بھرے جُھرّیوں والے ہاتھوں سے ٹوٹے ہوئے کناروں والی چائے ک
پیالیاں اُنہیں تھماتے ہوئے ایک خاص سُر میں حرکت کرتی تھی۔

"آج کا سکور کیا ہے؟" مشاہد نے اُس کی طرف دیکھے بنا پوچھا۔

وہ ہنسی — چند دانت، بہت سارے خلا اور خلا پر کروٹیں لیتے جھکتے ہونٹ جو
مُرجھاہٹ سے مُردہ ہو چکے تھے — "میں تیس گرگابیوں کو ایڑھیاں لگا چکی ہوں۔ صرف
بیس اور — اور میرے دن کا خرچہ نکل آئے گا — تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"بس یونہی —"

"اِسے بتایا ہے کہ میں کون ہوں —" اور جب اُس نے "اِسے" کہا تو آنکھ سے
ایک اشارہ کیا اور آنکھ کے گرد جھریوں کے جال نہ ہوتے تو یہ اشارہ بہت پُرکشش ہوتا۔

"نہیں —"

"تو پھر بتاؤ ناں مشاہد جی —"

"یہ نُوراں ہے —"

اِسے چھپانے کا، مجھ سے راز رکھنے کا کوئی جواز تو نہ تھا پھر مشاہد نے ایسا کیوں
کیا... آج تک اِس نے کوئی بات کوئی شخص مجھ سے خفیہ نہیں رکھا... وہ اپنی ناپسندیدگی کو
ضبط کر گئی اور پھر نُوراں کی طرف دیکھا اور مسکرائی... اُس نے دیکھا تو وہ جھکی اور ہتھیلی

لے گئی اور جھکنے میں اُس کے جوڑوں کے درد نے اسے بہت اذیّت دی۔ "اِسے
اس نے آنکھ سے پھر وہی اشارہ کیا "تمہاری بیگم صاحبہ کو — چھت پر لئے چلتے

اوپر چھت پر اُن کی آنکھیں چندھیائی ہوئی بند ہونے لگیں... جیسے قیدی اپنی
کوٹھڑی میں سے باہر صحن میں قدم رکھتا ہے۔
وہاں ایک وسیع کمرہ بھی تھا — جس کے ایک چوتھائی حصے میں چھت کے ساتھ
نم بالکونی بھی تھی — بالکل خالی اور ویران اور شہر پر کھُلتی اگرچہ اب کیلوں سے بند
ان کے رنگین شیشے کہیں تھے اور کہیں نہیں تھے —
"تم اپنی بیوی کو بتاؤ کہ یہ کمرہ کس کام آتا تھا؟"
"تم بتاؤ —"
"نہیں تم بتا دو مشاہد جی —"
اُس نے اُس کا یہ "مشاہد جی" کہنا بھی ناپسند کیا۔
"یہاں دارو مہاراجہ کے لیے رقص کرتی تھی اور وہ اوپر بالکونی پر بیٹھ کر دیکھتا تھا
ڈانسنگ رُوم تھا —"
"یہ بہت چھوٹا نہیں — ڈانسنگ کے لیے —"
"دارو عام طوائف تو نہیں تھی —" نُوراں ناراضگی سے بولی "مجرا تو نہیں کرتی
— صرف ایک شخص کے لیے ناچتی تھی — تو ایک ناچنے والی کے لیے اور ایک
والے کے لیے کیا یہ کمرہ اور بالکونی کافی نہیں —"
"ہے —" برگیتا نے فوراً مان لیا اور اُس کی نظریں اُس پتنگ کا پیچھا کرنے لگیں
سنگ رُوم کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے ڈولتی گرتی نظر آ رہی تھی اور اُس کے
نظر میں مسجد وزیر خان کے دو مینار ساکت تھے، لاہور شہر کا شور تھا اور بُرج اور
ے تھے —

"تاریخ لاہور" کا مصنف کنہیا لال ہندی کہ کایستھ باشند شائستہ قوم.... لال حویلی
رے میں خاموش ہے کہ اُس کے عہد میں شائد یہ ابھی زیر تعمیر تھی لیکن اسی نقشے کی
ور حویلی کے بارے میں مرقوم ہے کہ حویلی کلّو بائی المشہور اہلو والیہ محلّہ کچّی دروازہ
متصل کہی جاتی ہے۔ عمارت اس کی نہایت مستحکم و پختہ چُونہ گچ ہے۔ بیچ میں کھُلا ہوا

صحن ہے اور چاروں طرف دو منزلہ، سہ منزلہ پختہ عمارتیں ہیں۔ نواب ذکریا خان بہادر نے
یہ حویلی اپنی محبوبہ عورت کلّو بائی کی خاطر تعمیر کی تھی جو قوم کی مطربہ تھی۔

دارو بھی قوم کی مطربہ تھی۔

اور موراں بھی قوم کی مطربہ تھی جس نے مسجد موراں طوائف بازار پاپڑ منڈی علاقہ شاہ عالمی دروازہ میں تعمیر کروائی — بانیہ اس کی موراں طوائف، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محبوبہ تھی — بازار پاپڑ منڈی، علاقہ شاہ عالمی دروازہ میں واقع ہے — اس کم عورت کی رسائی مہاراجہ کے دربار میں یہاں تک تھی کہ کوئی کام اس کے مشورے تجویز کے بغیر نہ ہوتا تھا۔

بفضلِ ایزدِ دارائے افلاک - چہ موراں مسجدے آراست بر خاک

دارو عام طوائف تو نہیں تھی — مجرا تو نہیں کرتی تھی۔

"مشاہد جی — میں شائد ایک برس بعد اوپر آئی ہوں — میرے جوڑوں کا درد مجھے لے بیٹھا ہے اور ابھی مجھے گرگابیوں کے بیس جوڑے اور بنانے ہیں —"

وہ — نُوراں — اُس کمرے میں یوں چلتی تھی جیسے ابھی رُکے گی اور پھر بالکونی کی طرف دیکھے گی اور پھر بازو اُٹھا کر اُن کا گھیرا بنا کر گردن لچکا کر ذرا کولہوں کو ہلکی حرکت دے کر ناچنے لگے گی۔

ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے جو آسمان دِکھتا تھا اُس میں رنگ برنگے گڈّے اور پتنگیں نیلاہٹ میں تیکھی بل کھاتی کشتیوں کی طرح تیرتے تھے۔

"تم نے اِسے میرے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟" وہ بے دانت ہنسی دو مرجھائے ہوئے ہونٹوں میں سے ظاہر ہوئی۔

"یونہی —"

برگیتا کے اندر ایک اور سُول چبھی۔

وہ جیسے مشاہد سے مخاطب ہوتی تھی اُس میں — اُس کے طرزِ تخاطب میں ایک ایسی اپنائیت تھی جو صرف جنسی قربت کے بعد ظاہر ہوتی ہے — اور یہ ممکن نہ تھا — عمروں کا تفاوت — اور کیا یہ واقعی ممکن نہ تھا —؟

ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے —

آسمان میں رنگ برنگے گڈّے اور پتنگیں کندھے مارتے ہوئے بلند ہوتے ہوئے

نکھی بل کھاتی کشتیاں نیلاہٹ میں —
کمرہ — جہاں ایک بالکونی — ایک شخص اور ایک ناچنے والی اور ٹوٹے ہوئے
نوں میں سے بل کھاتی کشتیاں — یہاں — جنہاں تھاواں تے عشق دھمال پائی —
نُوراں نے انہیں دیکھا "عبدالرحمٰن چغتائی جی کو جانتے ہو —"

"ہاں —"
"اُن کے بھائی عبدالرحیم جی کو جانتے ہو؟"
"نہیں —"
"وہ میرے مور ڈانس کا شیدائی تھا — میں اُن دنوں سچ مُچ ایک مورنی تھی —
مشاہد جی —" بے دانت مسکراہٹ... جوڑوں کا درد، جُھرّیاں اور ابھی شہر کی مورنیوں
پاؤں کے لیے بیں اور گرگابیاں۔
"یہ کون تھی؟" پیچ دار سیڑھیوں کی تنگی میں سنبھلتے اُترتے برگیتا کی اندھیرے میں
دے ڈری آواز آئی۔
"دارو کی پوتی — نُوراں...."
اسی لیے تو چار چیزیں ہیں —
اور چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں — اُن میں سے ایک شکار ہے
ر آباد کے آس پاس — اور وادی سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے — اور کامران کی
بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے — اور چوک چکلہ ہے — جہاں لال
لی ہے — جس میں نُوراں ہے...
ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے —

وہ لم ڈھینگ سا نوجوان بارِیش پادری تھا جو آنکھیں بند کر کے گردن لمی
ہارمونیم پر اُنگلیاں چلاتا ایک عجیب عالمِ سرخوشی میں یا شائد عالمِ بالا میں پہنچا ہوا، جس
اُس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے تھے وہ بہت ہی مگن گاتا تھا اور اُس کا گیت کچھ
لگتا تھا اور کچھ دیر بعد کھلتا تھا کہ وہ سویڈش یا انگریزی میں نہیں بلکہ پنجابی میں
یسوع اَج آیا سی —— الاپ رہا ہے اور ڈھیروں ثواب کما رہا ہے۔ جب وہ "یسوع" کا
ادا کرتا تو اُس کی تان ایک قوال کی طرح —— وہاں تک لے جاتا جہاں اُس کا سانس اکھ
کو آتا اور اُس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا۔

اپّر مال کی ظفر علی روڈ کے آخر میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جہاں سے
کچی آبادی کا آغاز ہوتا ہے وہاں ایک پُر آسائش مغربی طرز کے گھر کے اندر قالین پر
گرم ماحول میں —— چمکیلے بھڑکیلے اور شوخ رنگے کپڑے زیب تن کئے خواتین جن میں
کی سیاہ رنگت مزید بہار دکھاتی تھی، ربن لگائے اور سرخ ہینڈ بیگز تھامے، سرخ ہائی
شوز میں اور جنٹل مین —— بڑے بڑے جہازی کالروں کی نیلی پیلی قمیضوں کے ساتھ
باٹم پتلونیں یا پھر چیک دھوتیاں پہنے اور رنگین پگڑیاں باندھے پُر آسائش گھر کے
قالین پر سر جھکائے سر دھنتے تھے اور جب راڈنی یعنی لم ڈھینگ پادری جی یسوع کی
لگاتے تھے تو وہ عقیدت سے اور جھکتے تھے لیکن —— اُس کرسمس کیک پر بھی مسلسل
رکھتے تھے جو اُن کے درمیان رکھا گیا تھا اور اُس کی مٹھاس اور کریم کی حلاوت اُن
گلوں میں اُترتی جاتی تھی اور شائد کچھ کمزور عقیدے والے یہ خواہش رکھتے تھے کہ پادری
جی کا کرسمس گیت ذرا شتابی سے اختتام تک پہنچے تاکہ یہ کیک نوش کیا جائے ——

آج کرسمس ہے ——
شہر میونخ میں آج کرسمس ہے
فاصلوں کی کمند سے آزاد

میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے...

میرا دل ہے کہ شہر لاہور ہے جہاں — آج کرسمس ہے اور راڈنی ایزبرگ المعروف پپو آنکھیں بند کئے ثواب کے ساتویں آسمان پر پہنچا یسوع کی تان پر اپنا چہرہ سرخ سے سرخ کیے جا رہا تھا...

مشائلہ نے اپنا وائن گلاس اُٹھایا اور اُس کی خالی تہہ میں ایک مرتبہ پھر جھانک کر واپس میز پر رکھ دیا۔ وائن کی مزید بوتلیں راڈنی کے ذاتی کپ بورڈ میں محفوظ تھیں جس کی چابی ظاہر ہے راڈنی کی جیکٹ میں تھی اور وہ یہ جیکٹ اس وقت پہنے ہوئے تھا اور اگر اس لمحے جب وہ یسوع کی تان لگا رہا تھا مشائلہ اُس کے پاس جا کر اُس کی جیب چابی کے لیے ٹٹولتی تو وہ اپنا کرسمس کیرل منقطع کئے بغیر اُسے ایک جھانپڑ رسید کر دیتا — اسی لیے اپنی بوریت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر اُس نے اپنا وائن گلاس اُٹھا کر اُس کی خالی تہہ میں ایک مرتبہ پھر جھانک کر واپس میز پر رکھ دیا تھا —

اور پھر مشاہد کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی ایک اور جمائی روکنے کی کوشش میں ایک بیزار شکل کا چند لمحوں کے لیے مالک بن چکا تھا۔

"سکول — " مشائلہ نے اپنا گلاس بلند کر کے لبوں سے چھُوا "میری کرسمس شیل — "

"میری کرسمس ٹو یُو ٹو مشائلہ — " اُس نے شائد آج سترھویں بار مشائلہ کو میری کرسمس کہا تھا۔

مشائلہ سکینڈے نیوین بھرے بدن، سنہری بالوں اور بے باک مسکراہٹ کا حسن تھی۔ اُس کے گالوں پر جو لالی تھی وہ وائن کی کم اور کھلی فضا میں کام کرنے والی کھیت عورتوں کی زیادہ تھی۔ وہ موٹاپے سے ذرا ادھر جہاں جنس کہتی ہے کہ بس ایں جا است... تا ذرا ادھر تھی لیکن سکینڈے نیوین اخلاقیات سے کوسوں دور تھی — وہ باقاعدہ ایک گھریلو اور باعصمت قسم کی دوشیزہ تھی — یعنی شادی سے پہلے تک — کیونکہ وہ دہلی میں متعین ایک سویڈش مشنری کی اکلوتی اولاد تھی اور چرچ کے برآمدوں میں پلی بھی تھی اور بڑی بھی تھی۔

ایک بہت ہائی نوٹ پر یکدم کرسمس کیرل ختم ہو گیا اور راڈنی نے ایک پاکیزہ لیکن ذرا سے متکبر شرماہٹ کے ساتھ تالیوں کے جواب میں سر ہلایا اور پھر ایک مقدس فریضے